

غزل 4: سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے

سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے ورنہ اتنے تو مرا سم تھے آتے آتے

مفہوم: شاعر کہتا ہے کہ جانے والا شخص تمام روابط ختم کر گیا ورنہ ان کے درمیان اتنے تو تعلقات تھے کہ وہ آتے جاتے رہتے، یعنی کچھ نہ کچھ رابطہ ضرور رہتا۔

تشریح: تشریح طلب شعر غزل "سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے" سے لیا گیا ہے جس کا پس منظر یہ ہے کہ شاعر کا محبوب اس کی زندگی سے چلا گیا ہے۔ شاعر نے اپنے احساسات اور جذبات کو بیان کرنے کے لیے غزل لکھی ہے۔

احمد فراز ان چند شعرا میں سے ایک ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں اپنی شاعری کی مقبولیت کے سورج کو پوری آب و تاب سے دیکھا ہے۔ جدید غزل گوئی کا تصور آج بھی احمد فراز کے بغیر ممکن نہیں۔ احمد فراز کی شاعری میں حساسیت، جذباتیت، اور انسان دوستی کے مضامین ہیں۔ ان کی غزلوں میں محبوب کی جدائی، معاشرتی ناہمواریوں اور ظلم کے خلاف بغاوت کا عنصر بخوبی جھلکتا ہے۔ انداز تحریر سادہ اور دل کو چھو جانے والا ہے منفرد انداز تحریر ہے دیگر غزل گو شعرا کی طرح محبوب کو بے وفا نہیں کہتے بلکہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہیں آپ کی زیادہ تر شاعری انقلابی شاعری ہے۔ جو ضمیرِ مردہ میں جان ڈال دیتی ہے۔ یہ شعر غزل کا مطلع ہے جس میں قافیہ اور ردیف جاتے آتے، جاتے جاتے استعمال ہوا ہے اور "جاتے جاتے" کی تکرار استعمال ہوئی ہے سلسلے اور مراسم کو انسانی جذبات سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اس شعر میں شاعر جدائی اور تعلقات ختم ہونے کا ذکر کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب اس کا محبوب یا عزیز شخص اس کی زندگی سے رخصت ہوا تو تمام تعلقات ختم کر کے گیا۔ یہ وہ تعلقات تھے جو ان دونوں میں ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں لیکن اس کے جانے کے بعد وہ تمام سلسلے، روابط اور رشتے ٹوٹ گئے شاعر کی زبان میں "سلسلے" کا مطلب محض ملاقاتیں یا بات چیت نہیں بلکہ دل کے رشتے اور محبت کے وہ سلسلے ہیں جو اب ختم ہو چکے ہیں۔ حالانکہ ہمارا دیرینہ تعلق رہا ہے اور ہم رسمی تعلق رکھ سکتے تھے۔ عاشق کا محبوب سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور وہ کسی قیمت پر یہ تعلق ختم نہیں کرنا چاہتا وہ چاہتا ہے کہ آخری حد تک محبوب سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق برقرار رہے چاہے وہ انتہائی معمولی نوعیت کا ہی کیوں نہ ہو احمد فراز بھی یہی چاہتے ہیں اگر محبوب محبت کا گہرا رشتہ نہیں رکھنا چاہتا تو کوئی بات نہیں لیکن اسے مکمل طور پر ترک تعلق نہیں کرنا چاہیے بلکہ اتنی طویل رفاقت کے بعد اتنا تعلق تو برقرار رہے کہ ہم ایک دوسرے کے یہاں آتے جاتے رہیں اور ہمارا ایک رسمی تعلق بحال رہے لیکن محبوب نے جاتے جاتے تمام تعلق توڑ دیئے ہیں اور ہر قسم کا رابطہ ختم کر دیا ہے۔ یہ شعر محبت اور دل گستگی کی ایک گہری تصویر کشی کرتا ہے جہاں ایک طرف محبت کے گہرے رشتے ہیں اور دوسری طرف ان رشتوں کے ٹوٹنے کا درد ہے۔ اس شعر میں شاعر نے مبالغہ آرائی کا استعمال کیا ہے اور شاعر کے درد اور مایوسی کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔

بقول شاعر:

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجیے رشتہ دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

شکوہ ظلمت شب سے تو کیا کہیں بہتر تھا اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جلاتے

شعر 2

مفہوم: شاعر کہتا ہے کہ رات کی تاریکی کی شکایت کرنے سے بہتر ہے کہ ہم اپنے حصے کی شمع جلا دیتے یعنی اگر ہر کوئی اپنی ذمہ داری پوری کرے اور عملی کوشش کرے تو مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

تشریح: احمد فراز کی شاعری میں الفاظ کا انتخاب، روانی اور غزل کی کلاسیکی روایت کے ساتھ جدیدیت کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ اس شعر میں شاعر نے منفی سوچ اور عملیت پسندی کے درمیان فرق کو بیان کیا ہے احمد فراز کا یہ شعر معاشرتی اصلاح اور انفرادی ذمہ داری کے احساس کو اجاگر کرتا ہے شاعر نے اس شعر میں نہایت عالمانہ انداز اپنایا ہے اور شعری خوبصورتی کے لیے "ظلمت شب" کو مشکلات اور مصیبتوں کا استعارہ قرار دیا ہے۔ شمع کو امید اور روشنی سے تشبیہ دی ہے اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ آج ہر شخص کو کسی نہ کسی سے کوئی شکایت ہے کوئی حکومت کے غلط اقدامات پر تنقید کرتا ہے، کسی کو اپنے پڑوسیوں سے شکوہ ہے، کسی کو اپنے والدین اور رشتے داروں سے شکایت ہے اور کسی کو اپنے دوستوں سے گلے ہیں۔

غرض سب کو کسی نہ کسی سے شکایت ہے لیکن اگر اُس سے پوچھا جائے کہ وہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے خود کیا کوشش کر رہا ہے تو اُس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ یعنی ہر شخص محض شکوے شکایتیں کرتا ہے لیکن اُن مسائل پر غور کر کے اُن کا حل تلاش کرنے کی کوئی عملی کوشش نہیں کرتا۔

شاعر کہتا ہے کہ رات کی تاریکی کا گلہ کرنے سے بہتر ہے کہ اپنے حصے کا کوئی چراغ جلایا جائے اور اس اندھیرے کو جہاں تک ہو سکے کم کرنے کی عملی کوشش کی جائے نہ کہ دوسروں پر تنقید کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنالیا جائے۔ بلکہ حالات کا شکوہ کرنے کی بجائے حالات کو بہتر کرنے کی عملی کوشش اور جدوجہد کو زندگی کا مقصد بنالیا جائے۔ اپنے کردار سے ایک ایسی مثال پیش کی جائے کہ دوسرے اس سے متاثر ہو کر اس پر عمل کریں۔ اس شعر میں شاعر نے حسن بیان کا استعمال کرتے ہوئے نہایت خوبصورتی سے اپنے خیالات کو الفاظ کا روپ دیا ہے جو قاری کو متاثر کرتا ہے۔ شعر میں "شکوہ ظلمت شب" کی مبالغہ آرائی کی گئی ہے تاکہ قاری پر گہرا اثر پڑے۔

بقول شاعر:

مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم
شعر 3 کتنا آساں تھا ترے ہجر میں مرنا جاناں پھر بھی اک عمر لگی جان سے جاتے جاتے

مفہوم: شاعر کہتا ہے کہ تمہاری جدائی میں مرنا کتنا آسان تھا لیکن جدائی کی تکلیف اتنی زیادہ تھی کہ مرنے میں بھی دیر ہو گئی۔
تشریح: اس شعر میں شاعر نے مرنا کو جدائی کے درد سے تشبیہ دی ہے اور ہجر کو محبوب کی جدائی کے لیے بطور استعارہ استعمال کیا ہے اس شعر میں شاعر کا انداز بیان بہت جذباتی اور عمیق ہے۔ اس شعر میں "جاتے جاتے" کی تکرار استعمال ہوئی ہے اور "حسن بیان" کا استعمال کرتے ہوئے نہایت خوبصورتی سے اپنے خیالات کو الفاظ کا روپ دیا ہے جدائی کے درد کو بہت خوبصورت اور سادہ الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عاشق کے لیے محبوب کی جدائی انتہائی تکلیف دہ ہوتی ہے شاعر سمجھتا تھا کہ محبوب کے بغیر جینا بہت مشکل ہو گا اور مرنا بہت آسان ہو گا لیکن محبوب سے جدا ہونے کے بعد اُسے احساس ہوا کہ محبوب کے بغیر نہ جینا آسان ہے اور نہ مرنا۔ جدائی میں اُس کی زندگی تڑپتے ہوئے گزرتی ہے اور جان سے جاتے ہوئے بھی ایک طویل عمر لگ جاتی ہے۔ "اک عمر لگی" میں مبالغہ آرائی کا استعمال شاعر کے درد کو زیادہ شدت کے ساتھ ظاہر کرتا ہے۔ اور اس دوران وہ شدید اذیت اور غم کی کیفیت سے گزرتا ہے یہاں ہجر کے لمحات کی طوالت سے مراد ہے یعنی محبوب کی جدائی میں بسر ہونے والی چند گھنٹیاں بھی عاشق کو ایک طویل عمر کی طرح محسوس ہوتی ہیں۔

بقول شاعر: مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں
شاعر کے لیے جدائی کی کیفیت ایک تکلیف دہ صدمہ ہے اور اس صدمے کے ساتھ وہ نہ آسانی سے جی سکتا ہے اور نہ ہی مرنا اس کے لیے آسان ہے اس کیفیت کو احمد فراز نے ایک اور شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد یہ معلوم کہ تو نہیں تھا تیرے ساتھ ایک دنیا تھی

شعر 4: جشن مقتل ہی نہ برپا ہو اور نہ ہم بھی پابجولاں ہی سہی ناچتے گاتے جاتے

مفہوم: اس شعر میں شاعر نے طنز آگاہ ہے کہ اگر مقتل گاہ میں جشن ہوتا تو ہم بھی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ناچتے اور انقلابی گیت گاتے جاتے۔
تشریح: یہ شعر ظلم اور جبر پر طنزیہ تبصرہ کرتا ہے اور انسان کے جذبہ بغاوت کو اجاگر کرتا ہے۔ یہاں شاعر نے طنز کو بہت عمدگی سے استعمال کیا ہے۔ مقتل (قتل گاہ) کی سنگینی کو جشن کے متضاد تصور کے ساتھ ملا کر ایک گہرا اثر پیدا کیا ہے۔ احمد فراز کا یہ شعر جدوجہد، بہادری اور خودداری کا ایک بہترین نمونہ ہے اس شعر میں شاعر نے نہایت خوبصورت الفاظ میں اپنے دل کی کیفیت کو بیان کیا ہے جو قاری کے دل پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔

فراز کی شاعری کا بڑا حصہ انقلابی شاعری پر مشتمل ہے وہ پاکستان میں امریت پر سخت تنقید کرتے تھے جس کی وجہ سے انھیں جیل میں بھی ڈالا گیا اور انھیں جلا وطنی کی زندگی بھی گزرا نا پڑی۔ ان کی ادبی خدمات کی وجہ سے انھیں ہلال امتیاز سے بھی نوازا گیا لیکن حکومت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے انھوں نے یہ اعزاز بھی واپس کر دیا۔

اس سے فراز کے مزاج اور اُن کے سیاسی خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس شعر میں بھی وہ انہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ حکمران طبقہ عوام کی بات کرنے والوں پر ظلم ڈھاتا ہے اور انھیں قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس شعر میں "جشن مقتل" ایک گہرا استعارہ ہے جو مخالفین کی خوشی اور شاعر کی مشکلات کو ظاہر کرتا ہے۔ اور "پابجوالاں" اور "ناچتے گاتے" کا تضاد شاعر کی خودداری اور عزم کو ظاہر کرتا ہے۔ احمد فراز اپنے آپ کو ایک باغی اور انقلابی کے طور پر پیش کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ حکومت پر تنقید کرنے کی پاداش میں اگر انھیں قتل کرنے کے لیے لایا گیا تو وہ جان دینے سے ہرگز نہیں ہچکچائیں گے بلکہ اُن کے پاؤں میں بیڑیاں ہونے کے باوجود وہ رقص کرتے ہوئے اور انقلابی گیت گاتے ہوئے قتل گاہ کی طرف جائیں گے کیونکہ ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے اور ظالم کو لکارتے ہوئے مارا جانا ایک اعزاز کی بات ہے۔ بقول شاعر:

جس سچ دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے

یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی تو کوئی بات نہیں

عام طور پر موت کو ایک تکلیف دہ اور اذیت ناک عمل سمجھا جاتا ہے لیکن فراز نے یہاں "حسن بیان" سے کام لیتے ہوئے ناچتے گاتے اور جشن کے الفاظ استعمال کر کے اُسے حسین اور پُر مسرت عمل بنا دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ظلم کے خلاف لڑنے والے موت سے نہیں ڈرتے بلکہ خوشی خوشی موت کو گلے لگاتے ہیں کیونکہ اُن کی موت قوم کی فلاح اور قوم کی ترقی کے لیے ہوتی ہے بقول شاعر:

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ

جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

شعر 5: اس کی وہ جانے اسے پاس وفا تھا کہ نہ تھا تم فراز اپنی طرف سے تو نبھاتے جاتے

تشبیہ: وفا کو انسانی رویوں سے تشبیہ دی گئی ہے، استعارہ: "پاس وفا" کو وفاداری کی قدر کے طور پر استعمال کیا گیا ہے

مفہوم: اس شعر میں شاعر نے اپنی وفاداری اور محبت کو بیان کیا ہے کہ اُسے محبوب کی وفاداری کا تو معلوم نہیں مگر تم (فراز) اپنی طرف سے تو محبت اور وفا کا حق ادا کرتے رہتے۔

تشریح: احمد فراز کی شاعری میں محبت، غم، ظلم اور بغاوت کے موضوعات کو بہت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کا طرزِ تحریر بہت سادہ اور بامعنی ہے جو قاری کے دل میں اُتر جاتا ہے ان کے اشعار میں جذبات کی گہرائی اور انسانی زندگی کی حقیقتیں نمایاں ہیں۔ یہ فراز کا مخصوص اسلوب ہے جس سے وہ شاعری میں حسن اور تاثیر پیدا کرتے ہیں یہ شعر غزل کا مقطع ہے۔ غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرے مقطع کہلاتا ہے

اس مقطع میں فراز اپنے محبوب سے شکایت کرنے کی بجائے اپنا محاسبہ کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ محبوب وفا کا خیال رکھتا ہے یا نہیں رکھتا یہ اس کا معاملہ ہے میرا کام یہ ہے کہ میں اپنے کیے ہوئے وعدے نبھاتا جاؤں۔ روایتی شاعری میں عام طور پر محبوب کی بے وفائی کا تذکرہ ہوتا ہے شاعر محبوب کو بے وفا اور ستم گر کہہ کر شکوے شکایتیں کرتے ہیں جیسے کہ مرزا غالب کہتے ہیں:

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید

جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

لیکن یہاں شاعر روایتی مضمون سے ہٹ کر ایک نئی بات کر رہا ہے وہ کہتا ہے محبوب وفا کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ اس کا فیصلہ اُسے کرنے دیا جائے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں نے جو وفا کے عہد کیے ہیں میرا کام یہ ہے کہ وہ نبھاتا چلا جاؤں۔ یہ نہ دیکھوں کہ اگر محبوب وفا کرے گا تو میں اس کے بدلے میں وفا کروں گا اگر وہ بے وفائی کرے گا تو میں بھی اپنے وعدے توڑ دوں گا بلکہ مجھے اپنے اعلیٰ اخلاقی کردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے وعدوں کو نبھانا چاہیے اور یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ محبوب اپنے وعدے نبھاتا ہے یا نہیں بقول شاعر:

مچھے معلوم ہے اہل وفا پر کیا گزرتی ہے

سمجھ کر سوچ کر تجھ سے محبت کر رہا ہوں میں

تشریح طلب شعر میں "وفا" کو انسانی رویوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو شاعر کے احساسات کی شدت کو ظاہر کرتے ہیں۔ "پاسِ وفا" بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے جو وفاداری کی قدر کے لیے محبت کی سچائی کو ظاہر کرتا ہے۔